آپ کا یہ یقین تھا کہ ترکِ حدیث ذلت و رسوائی کا پیش خیمہ بنے گی۔ اسی لیے صحابہ سے مروی احادیث کی کتابوں کے مطالعہ میں گم رہتے اور ہر قسم کے مسائل کے حل کے لیے انہی احادیث سے نتائج مستنبط کرتے رہے۔ علوم پر آپ نے احادیث کی روشنی میں کتابیں تصنیف کیں جو اپنے دائرہ کے اعتبار سے جامع اور مکمل ہوئیں۔ یحییٰ بن آدم فرماتے ہیں کہ:

"جب کوئی مسئلہ حضرت عبداللہ بن مبارک رح کی کتب میں نہ ملتا تو میں مایوس ہو جاتا۔" ۲۸۸ھ

اسی طرح معتمر بن سلیمان فرماتے ہیں:

ما رایت مثل ابن المبارک	حضرت عبداللہ بن مبارک کی مثل
نصیب عنده الشئ الذی	میں نے نہیں دیکھا۔ آپ سے ہمیں
لا یصاب عند احدٍ"	وہ کچھ مل جاتا ہے جو اور کسی کے
	ہاں نہیں ملتا۔" ۲۸۹ھ

احادیث کے بارے میں آپ کا جو یقین تھا، وہ منتہائی قسم کا تھا۔ جو کچھ کہا وہ آپ نے ثابت کر کے دکھایا۔ بشیر بن یحییٰ آپ کا قول نقل کرتے ہیں جو آپ نے حضرت امام ابو حنیفہ کے بارے فرمایا۔

علیکم بالاثر ولابد للاثر	یعنی تمہارے لیے حدیث لازم اور
من یعرف تاویل	ضروری ہے کہ حدیث انہی سے لی ہو
الحدیث ومعناه ۲۹۰ھ	اور انہی سے حدیث کی تاویل اور معانی
	سیکھے ہوں۔

اس قول سے جہاں ظاہری طور پر امام ابو حنیفہ کی علمِ حدیث میں نمایاں حیثیت واضح ہوتی ہے وہاں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک احادیث کے ظاہری معانی کو مراد نہیں لیتے تھے بلکہ جدید مسائل کو آثار کے آئینہ میں رکھ کے ان کے حل تلاش کرتے۔ یہ استنباط کہلاتا تھا جس کو حضرت امام ابو حنیفہ رح نے

۲۸۸ھ خطیب بغدادی: تاریخ بغداد: ۱۰: ۱۵۶: مطبوعہ مطبعۃ السعادہ مصر ۱۳۴۹ھ

۲۸۹ھ ابن ابی حاتم الرازی: کتاب الجرح والتعدیل: ج ۲ ق ۲: ۱۸۰: مطبوعہ دائرہ معارف عثمانیہ حیدرآباد دکن

۲۹۰ھ کردری: مناقب امام اعظم: ۱: ۱۰۶: مطبوعہ معارف نظامیہ حیدرآباد دکن ۱۳۲۲ھ

© rasailojaraid.com

رواج دیا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے اِس کو سراہا اور اس کی ضرورت و اہمیت کے پیشِ نظر حضرت امام ابوحنیفہ رح کی جامع پہلو شخصیت سے اِس کے اکتساب پر زور دیا۔ اِس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حدیث کی تاویل یا معانی کی تشریح کوئی بااثر عالم ہی کر سکتا ہے جسے قرآن و حدیث اور آثارِ صحابہ سے پوری پوری واقفیت حاصل ہو اور خود صاحبِ تقویٰ اور صاحبِ بصیرت ہو۔

روایت ہے کہ آپ کوفہ میں کتاب المناسک پڑھا رہے تھے۔ حدیث کے خاتمہ پر جب آپ نے اِس سے استنباط کرتے ہوئے کچھ فرمانا شروع کیا تو شاگردوں میں سے ایک شاگرد نے اِس قول کو لکھنا شروع کر دیا۔ آپ نے استفسار کیا کہ کس نے میرے قول کو لکھ لیا ہے۔ لکھنے والے نے بتایا کہ میں نے لکھا ہے آپ نے اِس پر اچھی خاصی بحث کی کہ ایک مکمل درس کی صورت بن گئی اور کہا کہ میں کون ہوتا ہوں کہ کوئی میرے قول کو لکھے۔ ۲۹؎

اِس قول سے آپ کی وہ احتیاط واضح ہوتی ہے جو احادیث سے مسائل کے استنباط کرنے والے کی خوبیوں کے پیشِ نظر ضروری ہے۔ اگرچہ آپ ان تمام خوبیوں سے متصف تھے، لیکن پھر بھی آپ نے کسرِ نفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ استنباط کے لیے کمال درجے کا علم اور تقویٰ ضروری ہے۔

اِس قول سے ایک اور بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ حالات کے مطابق ہر مسلمان کو احادیث کی روشنی میں مسائل کے استنباط کی اجازت ہے لیکن وہ رائے صرف اسی حد تک ہے اور اسی وقت تک ہے جب تک کہ کوئی اِس سے زیادہ علم والا موجود نہ ہو۔ جب اس سے بڑھ کر علماء موجود ہوں اور ان تک رسائی ممکن ہو تو ضروری ہے کہ ان کی طرف رجوع کیا جائے اور اپنی رائے چھوڑ کر ان کے استنباط پر عمل کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اِس خاص محفل میں جو اپنی سمجھ کی حد تک استنباط ہو سکتا تھا کیا لیکن اسے لکھنے کی اجازت اس لیے نہ دی کہ کوئی اسے حرفِ آخر سمجھ کر دیگر علماء کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ ترک نہ کر دے۔

اِس دور میں علماء سے مراد وہی لوگ تھے جن کو احادیث میں سند مانا

(باقی صہ ۳۵ پر)

۲۹؎ ابنِ جوزی: صفۃ الصفوۃ: ۴: ۱۱۰ مطبوعہ دائرہ معارف عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۳۵۶ھ

.com

لطیف احمد

حیاتِ سلیمانی کا ایک اہم ورق" پر ایک نظر

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری نے "حکمتِ قرآن"، نومبر ۱۹۸۵ء میں ایک مقالہ بعنوان "حیاتِ سلیمانی کا ایک اہم ورق" تحریر فرمایا ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اُن حضرات کا ذکر کیا ہے جنہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمہ کے ساتھ ادارہ الہلال میں بطور معاون کام کیا اور مولانا مرحوم کے رفیق کار رہے۔ جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) مولوی عبدالواحد ندوی علیہ الرحمۃ (۲) مولانا عبدالعمادی رحمۃ اللہ علیہ
(۳) مولانا عبدالسلام ندوی رح (۴) مولوی رکن الدین راناندوی مرحوم
(۵) علامہ سید سلیمان ندوی رح۔

ڈاکٹر ابو سلمان صاحب کے بیان کے مطابق علامہ سید سلیمان ندوی رح الہلال سے چار پانچ ماہ وابستہ رہے۔ بعدازاں اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی رح کے ایما پر پونا کالج میں عربی اور فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ مولانا ابوالکلام رح کو سید صاحبؒ کے اِس فیصلے کا بہت قلق ہوا اور مولانا آزاد مرحوم نے کئی مکتوب سید صاحبؒ کو اِس اصرار کے ساتھ تحریر کیے کہ وہ پونا سے واپس آکر الہلال کے لیے کام کریں اور بالآخر ۹ جنوری ۱۹۱۴ء کو مولانا آزاد نے ایک رجسٹری شدہ مکتوب سید صاحبؒ کو تحریر کیا جس میں واپسی کا بے حد اصرار ہے۔ اپنی جانب سے چند مراعات اضافہ اور مشاہرہ کی پیشکشیں ہیں۔ اس مکتوب کے بعض اقتباسات جی ابو سلمان صاحب نے اپنے مقالے میں نقل کیے ہیں۔ احقر راقم نے زبان وادب کے ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے مولانا

© rasailojaraid.com

آزاد مرحوم کے تذکرہ، غبارِ خاطر اور الہلال کے چند مضامین کا مطالعہ کیا ہے لیکن راقم سطور کو اس امر پر حیرت ہوئی کہ سید سلیمان ندوی رح کو جو مکتوبات تحریر کیے گئے ہیں ان میں مولانا آزاد مرحوم کا ادبانہ اسلوب اور انائی لب و لہجہ تقریباً مفقود ہے۔ اس کے برعکس ایک عجیب انداز کی لجاجت، معذرت و طلب کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لکھنے والے کا پیکر جس قدر آزاد ہوتا ہے اُسی قدر مقید بھی ہوتا ہے۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

بہرحال ڈاکٹر ابو سلمان صاحب نے اِس معمولی واقعہ پر جو استنتاج اور استنباط کیا ہے اسی کا مطالعہ یہاں مقصود ہے۔ یہ استنتاج دس نکات پر مشتمل ہے۔ قارئین کرام ان نکات کو خود ڈاکٹر صاحب ہی کی تحریر میں ملاحظہ فرمائیں۔ ہر نکتہ کے مقابل احقر کے معروضات ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے فرمودات : (۱) مولانا آزاد سے سید صاحب کی پہلی ملاقات لکھنؤ میں اوائل ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی جہاں وہ آپس میں بے تکلفانہ اور برابر کی حیثیت سے ملتے تھے لیکن جب وہ آٹھ سال کے بعد کلکتہ میں ان کی دعوت پر الہلال کے اسٹاف میں شمولیت کے لیے گئے تو دونوں کی حیثیتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا وہ اپنی خواہش کے مطابق تعیین وقت کے بغیر مولانا سے ملاقات بھی نہ کر سکتے تھے۔

احقر کے معروضات : (۱) ڈاکٹر ابو سلمان صاحب تو مولانا آزاد مرحوم کے بے حد مداح اور معتقد ہیں یہ بات لکھ کر انہوں نے آزاد مرحوم کی شخصیت کو پامال کرنے اور ان کے کردار کی یک رنگی کو مجروح کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ مدت کی دوستی اور بے تکلف تعلقات برطرف، افسری ماتحتی قائم، ڈاکٹر صاحب کے اس استنباط نے تو یہ ثابت کر دیا کہ مولانا آزاد مرحوم میں کسی درجے کی بھی مروت اور وضع داری نہ تھی، پھر لجاجت سے لبریز ۹ جنوری ۱۹۱۴ء کا مکتوب کیا معنی رکھتا ہے یقیناً مولانا آزاد مرحوم اس بے بنیاد قیاس کو سنتے یا پڑھتے تو ضرور آزردہ ہوتے۔

.com
.com

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ‌ ‌ ‌ ‌ کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

ڈاکٹر صاحب... (۱) سید صاحب مدیر الہلال کے بلند مقام کا سپنا تصور کرکے کلکتہ گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ الہلال میں سیاہ و سفید کے مالک اور اشاعت کے حاکم ہوں گے لیکن وہاں ان کے منصب میں ان سے سینیر ارکان شریک تھے۔

احقر... (۱) اس تجزیہ کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا گیا۔ اس کے برعکس ۹ جنوری ۱۹۱۴ء کے مکتوب آزاد سے اس قیاس کی تائید نہیں ہوتی۔ اس مکتوب میں تو مولانا آزاد نے مداخلت نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

"جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجئے مجھے اس کے اصول و پالیسی سے (جس میں آپ مجھ سے متفق ہیں) اور کسی بات سے تعلق نہیں" جن حضرات کو ڈاکٹر صاحب نے سینیر خیال فرمایا ہے وہ بھی الہلال میں ایک سال سے زیادہ نہ ٹک سکے، اس حقیقت اور وجوہ پر روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔

ڈاکٹر صاحب... (۲) ان کے تصور میں مدیر کا کام صرف یہ تھا کہ وقت کے حالات مسائل پر علمی و شذرات پر شذرات و مقالات لکھ کر دے اور کام ختم ہوا لیکن وہاں انہیں بہ اکراہ پروف ریڈنگ بھی کرنی پڑتی تھی حالانکہ یہ صرف دفتری بات تھی

احقر... (۲) یہ قیاس بھی خارجی اور داخلی شواہد سے معرا ہے۔ اگر کوئی معاہدہ ہوا تھا تو اس کا ذکر بھی لازم تھا۔ مذکورہ مکتوب سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پروف ریڈنگ کا کام سید صاحب علیہ الرحمہ کے فرائض سے زائد تھا۔

"پروف کریکشن کے لیے انور علی آ گئے ہیں اور اب اس کے لیے کوئی زحمت نہ"

ڈاکٹر صاحب... (۳) سید صاحب اپنی علمی صلاحیتوں کی بدولت اس وقت تک ایک خاص حلقے کی توجہ کا مرکز ضرور بن گئے تھے اور علمی مقالات لکھنے کے لیے انہیں کسی رہنمائی کی ضرورت نہ تھی لیکن ان کی اخباری زندگی کا یہ آغاز اور پہلا تجربہ تھا اور خاص اخباری نقطۂ نظر سے ان کی تحریریں اصلاح و ترمیم کے بغیر نہ چھپ سکتی تھیں، سید صاحب کو اس بات کا احساس نہ تھا۔

© rasailojaraid.com

احقر۔۔۔(۴) ڈاکٹر صاحب سے اِس سلسلے میں تسامح ہُوا ہے۔ سید صاحب کے لیے اِس نوعیت کا کام نیا نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحبؒ مئی ۱۹۱۲ء میں الہلال سے منسلک ہونے سے بہت پہلے بحیثیت نائب مدیر ماہنامہ "الندوہ" سے وقفہ وقفہ سے ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۲ء وابستہ رہ چکے تھے۔ اور صحافت سے اچھی طرح آشنا تھے۔

(تذکرہ سلیمان ص۴۵ طبع دوم ۱۹۸۴ء کراچی از مولانا غلام محمد صاحب مدظلہٗ)

ڈاکٹر صاحب۔۔۔(۵) بعض اوقات انہیں الہلال کے لیے کتابوں سے نقل و اقتباس مواد کی فراہمی اور ترجمہ کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اِس بات کو بھی وہ اپنے بلند مقام سے فروتر سمجھتے تھے۔

احقر۔۔۔(۵) اِس قیاس کی گنجائش خاص طور پر اِس لیے بھی پیدا نہیں ہوتی بلکہ سید سلیمان ندوی رحؒ کی تصانیف میں وہ سب کچھ موجود ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے سید رحؒ صاحب کے مقام سے فروتر فرض کرلیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو اِس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ علم کی دنیا میں وہی اعتبار پاتے ہیں جو ہر نوع کے علمی کام کو خوش دلی سے سرانجام دیتے ہیں۔ سید صاحبؒ تو اس دنیا میں، دنیا میں اپنا سکہ چلا چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔۔۔(۶) عام اخبارات کی روایت کے مطابق مختلف اخبارات کے ترجمے، شذرات نویسی، افتتاحیہ نویسی اور ترتیب و تالیف کے دیگر کاموں میں اسٹاف کے ارکان کا نام نہ آتا تھا۔ سید صاحب کو یہ بات پسند نہ تھی کہ وہ الہلال کے ادارے میں گم ہو کر رہ جائیں۔

احقر۔۔۔(۶) اِس قیاس کو ڈاکٹر صاحب نے کسی حوالے سے موثق نہیں کیا ہے۔ بہرحال احقر نے اِس سلسلے میں کچھ عرض کیا ہے وہ نمبر ۷ میں ملاحظہ فرمائیں۔

ڈاکٹر صاحب۔۔۔(۷) سید صاحب کا ایک مقالہ افتتاحیہ "مشہد اکبر" کے عنوان سے شائع ہُوا اس وقت کے حالات میں وہ پسند کیا گیا، اس کی خوب شہرت ہوئی، لیکن یہ شہرت صرف الہلال کے ایک مقالے کی تھی۔ چونکہ مقالے پر سید صاحب کا نام نہ چھپا تھا اس لیے اِس شہرت میں سید صاحبؒ کا نام نہ تھا

.com

سید صاحب اِس احساس سے قلب کو محفوظ نہ رکھ سکے۔

احقر... (۷) یہ بیان مبارک بھی بغیر کسی حوالے کے تحریر فرمایا گیا ہے۔ تصدیق کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔ ویسے یہاں اور نکتہ نمبر ۶ میں جو مفروضہ قائم کیا گیا ہے اس کا تعلق نام و نمود اور شہرت طلبی سے اتنا نہیں ہے جتنا دیانت علم سے ہے اگرچہ روایت صحافت کی دنیا میں آج بھی موجود ہے لیکن دیانتِ علم تو بڑی بات ہے اخلاقی اعتبار سے بھی جس طرح کل غلط تھی آج بھی غلط ہے۔ مسلمانوں میں دیانتِ علم کی جو روایت رہی ہے ڈاکٹر ابو سلمان صاحب اس سے بخوبی واقف ہیں کہ جس شخص نے کچھ لکھا ہے یا کہا ہے، اسے مؤلفین نے چھپایا نہیں بلکہ من و عن متعلقہ شخص کے نام سے ظاہر کر دیا ہے۔ ہر مسلمان پر یہی واجب ہے اور یہی اسے کرنا چاہیئے کہ یہی مسلمانوں کی علمی روایت ہے۔ اگر ظاہر ہونے والی بات کو پردۂ اخفا میں رکھا گیا تو اللہ تعالیٰ تو علیم و خبیر ہیں۔ رہی شہرت کی بات تو اِس سلسلے میں علامہ رح الہلال کے محتاج نہ تھے اللہ تعالےٰ نے اس خصوص میں انہیں بے حدّ و حساب نوازا ہے۔

؎ بالائے سرش ز ہوش مندی می تافت ستارۂ بلند

ڈاکٹر صاحب... (۸) ٹھیک اسی زمانے میں بعض انگریزی الفاظ کے عام اور اصطلاحی ترجمے کے بارے میں مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا آزاد میں نزاع کی صورت پیدا ہوگئی۔ سید صاحب اس بحث میں مولانا دریابادی کے ہم خیال تھے اور پسند نہ کرتے تھے کہ بحث ایک خاص انداز اختیار کرے لیکن اخبار کی پالیسی اور کسی مضمون یا مراسلے کی اشاعت یا عدمِ اشاعت کے فیصلے کا انہیں اختیار نہ تھا۔ وہ اِس سلسلے میں اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتے تھے

احقر... (۸) اگر یہاں چند انگریزی الفاظ اور اس کے عام اور اصطلاحی ترجمے کی مثالیں پیش کر دی جاتیں تو ایک طرف بے دست و پائی اور دوسری جانب ضد اور اختیار کی حقیقت زیادہ واضح ہو جاتی۔ ہم میں سے بہت سے علم اور تحقیق کی سطح پر ایک دوسرے کے ہم خیال ہوتے ہیں۔ لیکن کسی کو بھی یہ بے دست و پائی کا احساس یا اختیار کا غرّہ پیدا نہیں ہوتا۔ علم کی دنیا میں

© rasailojaraid.com

نہ اس کی ضرورت ہے نہ گنجائش ۔

موسوی بدین خود و عیسوی بدین خود

ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ (۹) الہلال میں سید صاحب کو جو امور انجام دینا پڑتے تھے ان کے بعد علم و تحقیق کے کاموں کے لیے وقت نہ بچتا تھا ۔ چنانچہ سید صاحب نے جو تین چار یا پانچ مہینے الہلال میں گذارے وہ بہت کم علمی کام کر سکے ۔ اور ایک دو ہی مضمون ان کے نام سے نکلے ۔

احقر ۔۔۔ (۹) اس قیاس میں بڑی صداقت ہو سکتی ہے لیکن قیاس بہرحال قیاس ہے الہلال سے جانے کی اصل حقیقت اور حقیقی اسباب تو سید صاحبؒ کے اس مکتوب میں درج ہیں جو انہوں نے مولانا آزاد کے بار بار کے اصرار کے بعد پونا سے جنوری ۱۹۱۴ء کی کسی تاریخ میں مولانا آزاد کو تحریر کیا ۔ سید صاحبؒ کا یہ مکتوب شاید دستیاب نہیں ہے ۔ اگر دستیاب ہوتا تو ڈاکٹر ابو سلمان صاحب اس کے اقتباسات درج فرماتے البتہ مولانا آزاد مرحوم نے سید صاحبؒ کے اس مکتوب کا جو جواب دیا ہے وہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں موجود ہے ۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی مرحوم نے مکتوبات سلیمانی جلد اول میں اسے شائع کر دیا ہے اور صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے ایک مختصر اقتباس پیش خدمت ہے ۔

" برادر جلیل و اعز ! سب سے پہلے تو میں آپ کا سچا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سچائی اور راستبازی کے ساتھ حسب وعدہ اپنے تمام خیالات ظاہر کر دیئے اور اس کے لیے احسان مند ہوں ، اس احسان عظیم کے لیے کہ آپ کے اس اظہار خیال سے مجھے بہت فائدہ پہنچا ۔ آپ یقین فرمائیں کہ آپ کے مکتوب کو میں نے تین بار پڑھا اور اس کے اثر سے بہت دیر تک روتا رہا ۔ نہ اس لیے کہ آپ نے جو کچھ لکھا وہ سب کچھ سچ تھا بلکہ اس لیے کہ اس میں سچ بھی تھا جس کے لیے میرے دل نے گواہی دی اور جو حالت ہمیشہ رہتی ہے اس کے لیے ایک تحریک قوی و مزید ہو گئی ۔ "

زیر نظر مسئلہ کے بارے میں مولانا آزاد مرحوم کی اس تحریر کے بعد

.com

تمام قیاسات و مفروضات خواہ وہ کسی گوشے سے ہوں بعید از حقیقت ہیں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ("اے ایمان والو! بہت تہمتیں کرنے سے بچتے رہو۔ مقرر بعض تہمت گناہ ہے۔" (سورہ الحجرات آیہ ۱۲)

ڈاکٹر صاحب ... (۱۰) انہی دنوں علامہ شبلی مرحوم کی کوششوں سے انہیں پونا کالج میں عربی فارسی کی اسسٹنٹ پروفیسری پیش کی گئی، ان شکایات کی موجودگی میں کالج کی ملازمت کی پیش کش نے انہیں خاص طور پر متاثر کیا اور الہلال کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا لیکن ان تمام شکایات میں بنیادی وجہ یہ احساس تھا کہ ادارت اور مولانا آزاد کی معاونت کا منصب ان کے مقام جلیل و رفیع سے فروتر تھا اور وہ اسے زیادہ دنوں تک گوارا نہ کر سکتے تھے۔ مرحوم کے اس مزاج نے انہیں زندگی بھر پریشان کیا اور کسی جگہ بھی وہ ٹک کر اور دلجمعی کے ساتھ کام نہ کر سکے۔ الہلال میں خدمات، پونا کالج کی ملازمت، دارالمصنفین میں کاروان علوم و معارف اور ارتقائے تصنیف و تحقیق کی رہنمائی، بھوپال میں قاضی القضاۃ کا منصب اور سرکاری دارالعلوم کی سربراہی اور آخر میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رح کی جگہ منصب شیخ الاسلامی کے لیے پاکستان کا سفر اور دستور سازی میں مشورہ و رہنمائی سے ان کا عدم اطمینان اور بے چینی کے پس منظر میں سید صاحب کے اسی مزاج کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انہیں یہ احساس زندگی بھر رہا کہ ان کے علم و فضل کے مطابق زمانے نے ان کی قدر نہیں کی اور انہیں ہر دور میں ان کے مقام سے فروتر کاموں کے لیے دوسرے ہاتھوں کے سپرد کیا جاتا رہا۔ پاکستان میں تو گویا جان بوجھ کر ان کی ناقدری کی گئی۔ ان کا مقام اس سے بہت بلند تھا کہ وہ پاکستان میں دستور سازی اور اسلامی فکری راہنمائی میں محض ایک مشیر کا کردار ادا کریں اور ان کے مشوروں کے ترک و اختیار کا فیصلہ نواب زادہ صاحب کریں۔ یہ اس عہد کا بہت بڑا المیہ تھا جو سلطنتِ علوم و معارف اسلامیہ کے سلیمان اعظم کے ساتھ پیش آیا۔

© rasailojaraid

احقر... (۱۰) اِس آخری نکتے میں جو باتیں کہی گئی ہیں حسبِ سابق وہ کسی بھی حوالے اور ثبوت سے معرا ہیں علاوہ ازیں ان میں علم کی متانت بھی خاصی کم ہے ۔ سیّد صاحبؒ کا کوئی ایسا قول یا تحریر نقل نہیں کیے گئے جن میں حضرتؒ کی فطری بے اطمینانی یا اپنے مقام کی بلندی اور اپنے مشاغل کی پستی یا ز ملنے کی قدر شناسی کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دیتی ہو۔ اِس کے برخلاف مولانا آزاد مرحوم کی تحریروں میں یہ احساس پوری شدت سے نمایاں ہے ۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

" افسوس کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کرسکا بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و اَلم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے مذہب، علوم و فنون، ادب، انشاء، شاعری کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار نئی راہیں مبدأ فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ بخششوں سے دامنِ دل مالامال نہ ہوا ہو، بہ حدے کہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کردیتی ہیں لیکن افسوس کہ جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا، اس نے شاید سر و سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اِس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کردیا گیا۔ "[58]

(مردِ حق از غلام رسول مہر۔ لیل و نہار لاہور مارچ ۵۸ء)

ع   میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اہلِ نظر انصاف فرمائیں کہ ناقدری زمانہ کی صدا کن لبوں سے بلند ہو رہی ہے ۔ اِس مقام پر مولانا عبدالباری ندوی علیہ الرحمہ. مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے تحریری اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جو سیّد صاحبؒ کے مزاج کے بارے میں ڈاکٹر ابوسلمان صاحب کے قیاس کی تردید کے لیے کافی ہیں۔

مولانا عبدالباری رح فرماتے ہیں :

.com

"سید صاحبؒ بطنی سید نہیں ماشاء اللہ بطنی سعید تھے۔ مرحوم معصوم نہ تھے لیکن ان کی زندگی کا جو رُخ طالب علمی سے لے کر آخر تک کم و بیش ہر نوع کے سابقہ میں سب سے زیادہ معصوم نظر آیا وہ یہی کہ خود رائی و خود پسندی دُور دُور تک نظر نہیں آئی۔"

(تذکرہ سلیمان ص۷۶)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم کہتے ہیں:

"مولانا شبلی کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ ان کو مولانا سید سلیمان ندوی رح کی شکل میں ایک ایسا شاگرد مل گیا جو وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، دقیقہ رسی اور علم و فن میں اسناد کا صحیح جانشین تھا اور ساتھ ہی اپنے اندر بہت سی خوبیاں اور کمالات رکھتا تھا جو اسی کا اپنا حصہ تھیں تشرع، تدین بلکہ تقشف اس کے قبائے علمی کا تکمۂ زرّیں تھا جس کے باعث کسی مسئلہ میں اختلاف کے باوجود علماء کو بھی اس پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے مزاج میں استقلال طبیعت میں صلح پسندی، مزاج میں مسکنت تھی۔"

(تذکرہ سلیمان ص۷۷)

پروفیسر رشید احمد صدیقی تحریر فرماتے ہیں:

"سید صاحبؒ کو کوئی مشتعل نہیں کر سکتا تھا وہ کسی حال میں بھی برہم یا بے اختیار نہیں ہوتے تھے۔ شکل صورت، وضع قطع چال ڈھال ہر اعتبار سے سید صاحبؒ کی شخصیت بڑی دل آویز اور قابلِ احترام تھی۔ ان کو دیکھ کر اور پا کر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے رسوا نہ کریں گے اور جب تک ساتھ رہیں گے زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہو گی۔"

(تذکرہ سلیمان ص۷۸)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"سید صاحب مرحوم کی بڑائی اور بزرگی کا جو معیار میں نے دیکھا

© rasailojaraid.c